شعری مجموعہ

ڈاکٹر شبیب رضوی

جناب سلیم سالک

کی نذر

شعیب رضوی

۱۳/۱۰/۲۰۱۲ء

شعری مجموعہ

لہو لہو غزل

ڈاکٹر شبیب رضوی

کتاب کا نام : لہولہوغزل

شاعر : ڈاکٹر شبیب رضوی

اشاعت : جنوری 2012ء

کمپیوٹر کتابت : ن۔ رضوی

طباعت : جے۔ کے۔ آفسیٹ پرنٹرز، جامع مسجد دہلی۔۶

تعداد : 500

قیمت : عام ایڈیشن 300 روپے

لائبریری ایڈیشن 500 روپے

اِس کتاب کی طباعت کے لیے جموں وکشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز سے مالی امداد حاصل کی گئی ہے۔ اِس کتاب میں ظاہر کی گئی آراء سے کلچر اکیڈیمی کا بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی تعلق نہیں اور نہ اس ضمن میں کلچرل اکیڈیمی پر کوئی ذمہ داری عائد ہوگی۔

ملنے کا پتہ :

☆ اندرون کاٹھی دروازہ، رعناواری سرینگر 9906685395

☆ مرزا پبلکیشنز، حسن آباد، رعناواری سرینگر 9419007939

☆ کتاب گھر، لالچوک، سرینگر

اپنی بات

میں اِس اعتراف کے ساتھ **"لہولہو غزل"** پیش کر رہا ہوں کہ اس میں شامل غزلیں باقاعدہ فنی احتساب یا دِقتِ نظر سے کیے ہوئے انتخاب سے عاری ہیں اور کئی سو غزلوں میں سے ایک سرسری مطالعہ کے نتیجے میں صرف اس اعتبار سے لے لی گئی ہیں کہ کسی غزل میں ایک دو شعروں کے زبان و بیاں کا انداز دلچسپ ہے، یا کہیں ردیف وقوافی کی رنگینی اور دلکشی کے سبب موضوع میں کشش پیدا ہو گئی ہے یا پھر کسی جگہ لفظیات میں نیا پن اور معانی و مفہوم میں تازگی ہے۔

ان غزلوں میں کسی خاص نظریہ کی متابعت ہے نہ منصوبہ بند سیاست، تاہم گزشتہ نصف صدی پر محیط شعری

مقتضیات نے مواد اسلوب اور اظہار میں جو تبدیلیاں پیدا کی ہیں اُن کا اثر ان غزلوں میں بھی ہے اور واضح طور پر ایک غزل سے دوسری غزل تک بُعدِ زمانی کی دُھوپ چھاؤں محسوس کی جاسکتی ہے۔

کربلا کے عوامل و عواقب کی طرف، میں ہمیشہ متوجہ رہا ہوں اِسی لیے بعض غزلوں میں اُس کا شعوری اظہار موجود ہے اور "لہولہوغزل" کے تسمیہ کا میرے وجدان و شعور میں استعارہ بن کر در آنا بھی شاید اُسی فکری عقیدت کی کرم فرمائی ہے۔

میں اس مجموعہ کا انتساب خراج محبت و عقیدت کے طور پر اُن ادیبوں شاعروں اور دانشوروں کے نام کرتا ہوں جو حالیہ دنوں میں ہم سے بچھڑ گئے اور بساطِ اُردو سے دامن جھاڑ کر اُٹھ گئے۔

☆☆☆

ترتیب

خدایا بخش دے لغزش کو در گزر کر دے
مجھے خود اپنی نگاہوں میں معتبر کر دے

یہ کب کہا کہ عطا مجھ کو بحر و بر کر دے
بس اک نگاہ، جو اِس سنگ کو گُہر کر دے

تو وہ سخی ہے کہ قطرہ طلب کروں تجھ سے
تو میرے دامنِ ہستی کو تر بتر کر دے

کروں گا کِشتِ تمنّا کا انتظار کہاں
ہر ایک تخم کو پَل بھر میں تو ثمر کر دے

کہاں تک اپنی ندامت سے روبکار رہوں
کچھ ایسا کر کہ مرے عیب کو ہُنر کر دے

میں تیری راہ چلوں اپنی رہبری کر کے
جو ہو سکے تو مجھے میرا ہمسفر کر دے

یہ روشنی کے لئے ہے عجیب خوش طلبی
کہ رات آنے سے پہلے اُسے سحر کر دے

○

دھوپ میں خوشبو کا دلکش استعارا سوچنا
زندگی پر مجھ سے بہتر ہے تمھارا سوچنا

صورتِ موہوم میں کوئی اشارا سوچنا
دل کُشا ہے بند آنکھوں میں نظارا سوچنا

پھینکتا ہے گھپ اندھیرے پر اُجالوں کی کمند
چاند بستر میں، دریچے پر ستارا سوچنا

اضطرابِ شوق کو پہنچا ہی دیتا ہے سکوں
موجِ طوفاں خیز کے اندر کنارا سوچنا

بات بڑھنے یا زباں کٹنے سے بہتر جانیے
کُنجِ خاموشی میں لفظوں کا گُزارا سوچنا

یاد رکھنا یاد کرنے سے بھی ہے دشوار تر
شعر کہہ کر شعر کو جیسے دوبارا سوچنا

اب تو یوں لگتا ہے جیسے ہو پُرانا سانحہ
جھیل، عکسِ کوہ، ہم تم اور شکارا سوچنا

○

ہاں میں ہاں بھی ملا خلاف بھی کر
زندگی اب مجھے معاف بھی کر

رسمِ دنیا تو ہے دل آزاری
رسمِ دُنیا سے انحراف بھی کر

آئینے میں بہت اُجالا ہے
ہاں مگر آئینے کو صاف بھی کر

میری جانب نگاہ بھر کر دیکھ
میرے ہونے کا انکشاف بھی کر

سانس لینا ہی زندگی تو نہیں
دل دھڑکنے کا اعتراف بھی کر

دور تک جسم سے نہ باہر جا
حجرۂ جاں میں اعتکاف بھی کر

اتنی یکسانیت نہیں اچھی
کچھ نہ کچھ مجھ سے اختلاف بھی کر

زندگی کو گلے لگائے ہوں
یہ ذرا سی خطا معاف بھی کر

☆☆☆

ذو قافیتین

○

زندگی کا عجب قصیدہ ہے
دامنِ روز و شب دریدہ ہے

ہر اُجالے میں ہے اندھیرا سا
یعنی ہر صُبح شب گزیدہ ہے

بزم ، شائستہ ہے! یہ بات نہیں
آج ہر شخص لب بُریدہ ہے

یہ محبت سے عشق تک کا سفر
تب عقیدت تھی اب عقیدہ ہے

جب سے کی ہے بُرائی رندوں کی
تب سے بنتُ العِنَب کشیدہ ہے

ہائے اُردو پرستیاں اپنی
جو بھی کہہ دیں ادب رسیدہ ہے

اِس توقُّع پہ جی رہا ہوں شبیبؔ
ہر دعا میری رب شُنیدہ ہے

○

وقت یوں روٹھا کہ یادِ رفتگاں تک لے گیا
کارواں کیا چیز، گردِ کارواں تک لے گیا

شدّتِ حالات میں اُس کا دِلاسا کم نہیں
زندگی کی دھوپ میں جو سائباں تک لے گیا

زخمِ دل بھرنے لگے تھے، اُس نے اچّھا ہی کیا
گفتگو کا سلسلہ تیر و کماں تک لے گیا

مرحبا اُس کا تصور میرے احساسات میں
جو لبِ خاموش کو حُسنِ بیاں تک لے گیا

اُس کے ہونٹوں کا تبسّم کس قدر شاداب تھا
ایک حرفِ بے نمو کو داستاں تک لے گیا

کون سا منظر تھا میری بند آنکھوں کے قریب
کیا اُجالا تھا کہ اَندیکھے جہاں تک لے گیا

سُرخرو خونِ وفا سے مقتلِ کشمیر ہے
یہ خیالِ شوخ رنگِ زعفراں تک لے گیا

کیسا ظالم ہے کہ اپنی لذّتوں کے واسطے
چھین کر مجھ سے مری اُردو زباں تک لے گیا

☆☆☆

○

انا میں تپتے رہے مہرباں کے ہوتے ہوئے
ہٹے نہ دھوپ سے ہم سائباں کے ہوتے ہوئے

شکستِ عزم کہاں' یہ ہے جذبِ خاک کہ ہم
زمیں پہ اُڑتے رہے آسماں کے ہوتے ہوئے

یہ آرزو کہ شعورِ رَوِش ہو سب سے جُدا
ہم اپنی راہ چلے کارواں کے ہوتے ہوئے

ہمیشہ ڈرتے رہے موسموں کی سازش سے
سدا سفر میں رہے آشیاں کے ہوتے ہوئے

عجب مزاج تھا تنہائیاں بسانے کا
مکیں ہوئے نہ کبھی ہم مکاں کے ہوتے ہوئے

کسی تعلقِ رنگیں کا خوابِ بے تعبیر
اُجاڑ جیسا بدن روح و جاں کے ہوتے ہوئے

سفینہ ڈوب نہ جاتا تو اور کیا کرتا
ملی نہ سمت کوئی بادباں کے ہوتے ہوئے

شبیبؔ طبعِ سخنور سے ہُوک اُٹھتی ہے
نہ قدرِ شعر ہو گر قدرداں کے ہوتے ہوئے

○

ہم جو احساسِ یقیں کو بھی یقیں کہہ سکتے
پھول کو ہونٹ ستارے کو جبیں کہہ سکتے

اُس کے بارے میں نہ کچھ اپنے تئیں کہہ سکتے
بات کہنے کی بھی ہوتی تو نہیں کہہ سکتے

یوں بھی ہوتا، کوئی یاد اُس کی منور رہتی
یہ بھی ہوتا کہ اُسے دل کا مکیں کہہ سکتے

یوں بھی ہوتا کہ خیال اُس کا مسلسل رہتا
یہ بھی ہوتا کہ اُسے بزم نشیں کہہ سکتے

ایک نازک سے تعلّق کا کوئی نام نہ تھا
اور ہوتا بھی تو کیا اُس سے کہیں کہہ سکتے

روشنی، پھول، شفق، چاند، مہکتا چہرہ
خواب اچھا تھا مگر کیا تھا نہیں کہہ سکتے

جیسا سوچا تھا، اگر لفظ بھی ویسے ملتے
شعر کچھ اور حَسیں اور حَسیں کہہ سکتے

آسمانوں کی خبر سچ تھی یہ مانا پھر بھی
کاش ہم اپنی زمیں کو بھی زمیں کہہ سکتے

○

ہم نے یوں بھی دُنیا کے قصّے لکّھے
لفظ کے بدلے کاغذ پر نقطے لکّھے

صحرا لکّھے ، جلتے ہوئے ذرّے لکّھے
نقشِ قدم سے وحشت کے رستے لکّھے

ماتھے پر یہ چند لکیریں مبہم سی
مٹتی ہوئی تہذیب کے ہیں کتبے لکّھے

کون پڑھے کُہسار پہ صبحوں کی تحریر
منظر منظر برف پہ ہیں شعلے لکّھے

اپنے دُکھ یوں بانٹے منزل والوں نے
میرے گھر کی سمت سبھی رستے لکّھے

دلکش ہے الزام کہ اس کے منہ سے ہے
اُس نے مرے پیکر پہ کئی چہرے لکّھے

خیر خبر کے خط بھی نہ پہونچے یاروں تک
جب بھی کبھی اُردو میں پتے ہم نے لکّھے

○

مری ہستی تو مُشتِ خاک تک ہے
پہونچ لیکن شہِ لولاکؐ تک ہے

سفر ہے اور آگے ، اور آگے
نظر بس سرحدِ افلاک تک ہے

چَھٹے گی دُھند اگلے منظروں کی
یہ موسم دیدۂ نمناک تک ہے

کون پڑھے کُہسار پہ صبحوں کی تحریر
منظر منظر برف پہ ہیں شعلے لکھّے

اپنے دُکھ یوں بانٹے منزل والوں نے
میرے گھر کی سمت سبھی رستے لکھّے

دلکش ہے الزام کہ اس کے منہ سے ہے
اُس نے مرے پیکر پہ کئی چہرے لکھّے

خیر خبر کے خط بھی نہ پہونچے یاروں تک
جب بھی کبھی اُردو میں پتے ہم نے لکھّے

○

مری ہستی تو مُشتِ خاک تک ہے
پہونچ لیکن شہِ لولاکؐ تک ہے

سفر ہے اور آگے ، اور آگے
نظر بس سرحدِ افلاک تک ہے

چَھٹے گی دُھند اگلے منظروں کی
یہ موسم دیدۂ نمناک تک ہے

نہ ہونا یا مرا ہونا بھی شاید
مرے احساس یا اِدراک تک ہے

سمٹ آئی جنوں کی بے کرانی
کہ صحرا دامنِ صد چاک تک ہے

خزاں پروردہ ہیں شاید وہی لوگ
نظر جن کی خس و خاشاک تک ہے

یہ میری سرفرازی ' سربلندی
نگوں سر خنجرِ سفّاک تک ہے

جلال و شان و شوکت ' کجکلا ہی
یہ خوشبو جسم کی پوشاک تک ہے

☆☆☆

رنگوں میں خوشبوؤں میں بہاروں میں لوٹ آ
تو مُسکرا کے کلیوں میں پھولوں میں لوٹ آ

یُوں مُسکرا کہ جاگ اُٹھیں تتلیوں کے رنگ
بچپن کا ہاتھ تھام کے یادوں میں لوٹ آ

ذرّے جہاں چمکتے ہیں شمعِ وفا لیے
تو اُلٹے پاؤں پھر اُنھیں راہوں میں لوٹ آ

کوئی خیال بھی ترا جیسا حسیں نہیں
آ گُنگنا کے پھر مرے شعروں میں لوٹ آ

گر ہو سکے تو بزم کی رعنائیاں نکھار
گر آ سکے تو بُجھتے چراغوں میں لوٹ آ

رنگیں بنادے جاتی ہوئی رات کا سماں
خوابوں کے راستے مری آنکھوں میں لوٹ آ

○

ہُنروری سے نہیں فکرِ باہُنر خالی
یہ اور بات کہ ہے دستِ کوزہ گر خالی

کوئی اُمید نہ آہٹ نہ آرزو نہ چراغ
ہمارے ہوتے ہوئے بھی ہے سارا گھر خالی

نظر کا رنگ دھواں ہو کے بن گیا منظر
پلک جھپکتے ہی بس ہوگئی نظر خالی

وہ اب بھی شوکت آباء پہ فخر کرتا ہے
چٹانیں ٹوٹ گئیں رہ گئے شرر خالی

کمر سے تیغ اُڑا لے گیا نہ جانے کون
ہمارے ہاتھ میں بس رہ گئی سپر خالی

گلی گلی میں اُجالا تھا اُس کے قدموں کا
جو وہ نہیں تو نظر آتا ہے نگر خالی

شبیبؔ جیسے کھنڈر ہے مری عمارت دل
فضائے صحن ہے سنسان بام و در خالی

ورق ورق گزشتہ باب ہو کے رہ گئے
سفر میں ہم پڑھی ہوئی کتاب ہو کے رہ گئے

ہم اُس کی داستاں میں تھے مگر بیاں نہیں ہوئے
بیاں ہوئے تو حرفِ انتساب ہو کے رہ گئے

سحر کہاں کہ رنگِ شب بھی آج روٹھنے لگے
جو خواب پہلے دیکھتے تھے خواب ہو کے رہ گئے

یہ کون سی کدورتیں ہیں شہر کی نگاہ میں
ہمارے گھر کے آئنے خراب ہو کے رہ گئے

فروغِ دید کیا کرے دل و نظر کے واسطے
اُجالے بڑھتے بڑھتے خود حجاب ہو کے رہ گئے

تمام چہرے حرف حرف بَن گئے شِکن شِکن
سوال اپنے آپ ہی جواب ہو کے رہ گئے

گُناہگار کا گُناہ اُس کی تنگ دامنی
ثواب گویا جان کا عذاب ہو کے رہ گئے

ہم ایک ذرّہ ہی سہی تڑپ تو ہے چمک تو ہے
یہ کیا کہ دن کا ڈھلتا آفتاب ہو کے رہ گئے

☆☆☆

○

میں جو اُس کے بیاں میں تھا ہی نہیں
لُطف گویا زباں میں تھا ہی نہیں

پھر یہ کیوں پڑھ رہے ہیں لوگ وہی
جو مری داستاں میں تھا ہی نہیں

بدگُماں وہ مرے یقین پہ ہے
یہ تو وہم و گماں میں تھا ہی نہیں

وہ پلٹ آیا خاکداں کی طرف
نُور پھر آسماں میں تھا ہی نہیں

دستکیں پھر بھی سُنتا رہتا ہوں
میں کہ اپنے مکاں میں تھا ہی نہیں

کل وہ ملتا تھا سب سے جُھک جُھک کر
تیر گویا کماں میں تھا ہی نہیں

بے گُناہوں کے خون سے پہلے
رنگ یہ زعفراں میں تھا ہی نہیں

کامیابی میں جو ہُوا ناکام
منزلِ امتحاں میں تھا ہی نہیں

○

کوئی دہلیز ہے اپنی نہ کوئی در اپنا
اتنا سرکش تو نہ تھا پہلے مقدر اپنا

اور اب اِس سے بڑا ہوگا کہاں گھر اپنا
یہی دُنیا ، یہی گردش ، یہی مَحور اپنا

دَم اُکھڑتا ہے، نظر خم ہے، قدم کانپتے ہیں
احتساباً ہے یہ دل عرصۂ محشر اپنا

خیمہء جاں کی طنابیں نہیں کُھلنے والی
آخری جنگ میں مصروف ہے لشکر اپنا

ہم کہاں اپنے لیے کوئی بُرا سوچیں گے
ہم بَھلا چاہیں تو چاہیں گے سراسر اپنا

کوئی حیلہ نہ بہانہ، نہ دلاسے کا فریب
چارہ سازوں سے تو بہتر ہے ستمگر اپنا

سنگ ہیں ہاتھ میں سب کے یہ خبر ہے سب کو
بے خبر اِس سے کہ محفوظ نہیں سر اپنا

ایک دن وہ تھا کہ ہر رنگ تھا ہم سے روشن
اب وہ موسم ہے کہ دُھندلا گیا منظر اپنا

☆☆☆

○

اُس کی نظر کے سب رنگوں کو کرنا ہے تسلیم غلط
اکثر اکثر خاموشی میں ہوتی ہے تفہیم غلط

اُس کی توجّہ آدھا سچ ہے، اُس کا تغافل آدھا جھوٹ
یعنی اُس کی نیّت بھی ہے نیم دُرست اور نیم غلط

ہجر کا پَل پَل صدیوں جیسا، وصل کی شب ہے لمحہ بھر
گردشِ ماہ وسال کی اب کے ہوگی ہر تقویم غلط

میرے اُس کے پھول ہیں یکساں گلشن کے بٹوارے میں
لیکن ہے صیّاد کے ہاتھوں خوشبو کی تقسیم غلط

کیسے ممکن سارے جہاں کا بوجھ اٹھالے لختِ جگر
کاندھے جس سے جُھک جائیں وہ علم غلط تعلیم غلط

شوخ زباں کی تلخی میں بھی چاہت کی شیرینی ہے
جذبوں کی تعظیم ہے بہتر لفظوں کی تکریم غلط

اپنی زباں پر قابو رکھو اپنا لہجہ ٹھیک کرو
میرؔ کے شعروں میں تبدیلی غالبؔ کی ترمیم غلط

○

اثر کی خشک فضا میں دُعائیں مانگتا ہے
وہ دشت دشت برستی گھٹائیں مانگتا ہے

عبث ہے سخت چٹانوں میں شاخِ تر کی تلاش
جو بے وفا ہیں وہ اُن سے وفائیں مانگتا ہے

وہ جھونپڑے میں ہے خوش پھر بھی اپنے چاروں طرف
بلند ہوتے گھروں سے ہوائیں مانگتا ہے

گِرا کے آج گراں گوشیوں کے سارے حصار
سَماعتوں کا درِ وا صدائیں مانگتا ہے

نہ جانے کون سی منزل قدم کو شَل کر دے
وہ اپنی راہ میں چاروں دِشائیں مانگتا ہے

یہ حال دیکھ کے ماضی کا سر نہ جُھک جائے
تباہ قافلہ اپنی رِدائیں مانگتا ہے

عجب ہے شوق کہ ہر شخص کا قدِ کوتاہ
دراز ہونے کو لمبی قبائیں مانگتا ہے

○

رنگ، خوشبو، چاندنی، موجِ صبا ہو جائے گا
تو مرے خوابوں میں آ کر کیا سے کیا ہو جائے گا

کس نے سوچا تھا کہ ایسا حادثہ ہو جائے گا
زندگی کے ساتھ تو بھی بے وفا ہو جائے گا

اِس لیے میں نے بھی تیرے نام پر سجدے کیے
جانتا تھا ایک دن تو بھی خُدا ہو جائے گا

اک ذرا میری طرف چشمِ کرم سے دیکھ لے
کچھ نہ بگڑے گا ترا، مرا بھلا ہو جائے گا

راستے سب بند کر رکھے ہیں دُنیا نے تو کیا
تو جہاں رکھ دے قدم وہ راستہ ہو جائے گا

تو پریشاں کر نہ اپنے دل کو میرے واسطے
جو بھی ہونا ہے مرا اچھا بُرا ہو جائے گا

میرے دُکھ پر مُسکرا، میری خوشی کے واسطے
عُمر بھر کا قرض اک پل میں ادا ہو جائے گا

☆☆☆

○

دُور تک ہیں روشنی کے سلسلے میرے لیے
سنگِ در سب ہو چکے ہیں آئینے میرے لیے

کام آئے یوں بھی دل کے حوصلے میرے لیے
منزلیں خود لے کے پہونچیں راستے میرے لیے

جب سے اپنے غم کو میں دُنیا کا غم کہنے لگا
ہو گئے ہیں سہل دل کے مرحلے میرے لیے

تنگ پڑتی جا رہی ہیں اِس زمیں کی وسعتیں
آسماں کی بندشیں سب کھول دے میرے لیے

اب تو کوئی یاد کرتا ہی نہیں شاید مجھے
کس کو فرصت ہے کہ پل بھر ہی جیے میرے لیے

اُن کی یادیں، اُن کی باتیں، اُن کی خوشبو، اُن کے خواب
قُربتوں کے بھیس میں ہیں فاصلے میرے لیے

اپنے اپنے زخم بھر جانے کی سب کو فکر ہے
کون اتنا ہے کہ دُنیا سے لڑے میرے لیے

سب میں خنجر سب میں پتھر ہی نظر آئے مجھے
ہاتھ جتنے بھی حمایت میں اُٹھے میرے لیے

☆☆☆

اس کی نظر کو حُسنِ نظر لکھ دیتا ہوں
رات کی تاریکی کو سحر لکھ دیتا ہوں

خط جو کبھی اُس شوخ کے گھر لکھ دیتا ہوں
آنسو، خوشبو حاشیے پر لکھ دیتا ہوں

اکثر یہ بھی ہوتا ہے تنہائی میں
بھولی باتیں یادوں پر لکھ دیتا ہوں

دھیرے دھیرے غم میں ہنسی آجاتی ہے
رفتہ رفتہ شب کو سحر لکھ دیتا ہوں

لمبی راتیں، چھوٹے دن اب بیت گئے
اُس کو گئے موسم کی خبر لکھ دیتا ہوں

اپنے آنسو، آنکھ میں اُس کی، دیکھ کے میں
ساحل، طوفاں اور بھَنور لکھ دیتا ہوں

تاکہ نہ بھٹکیں آنے والے بعد مِرے
نقشِ قدم پر حالِ سفر لکھ دیتا ہوں

○

رات سونے لگی خوابوں کو جگایا جائے
پھر سے روٹھے ہوئے رنگوں کو منایا جائے

آنکھیں جلنے لگیں، اب گھر بھی نہ جل جائے کہیں
خشک منظر کو دریچے سے ہٹایا جائے

کوئی رکھتا ہے کہاں قرض کی سانسوں کا حساب
زیست سودا ہے، سلیقے سے چکایا جائے

کسی شاداب سی حیرت میں مسلسل رہنا
اک سمندر ہے کہ قطرے میں سمایا جائے

اک جہاں بے خبری کا ہے خود آگاہی بھی
یہ وہ منزل ہے کہ پھر جا کے نہ آیا جائے

عالمِ فکر و خرد، چشمِ جنوں میں گویا
رنگِ صحرا ہے کہ ذرّے میں دکھایا جائے

کوئی لہراتا ہے رہ رہ کے ہَوا میں خنجر
میری خوشبو مرے پھولوں کو بچایا جائے

اپنے محور سے الگ ہٹ کے بکھر سکتا ہوں
میرے اندر ہی مجھے پھر سے بسایا جائے

☆☆☆

○

بہت اہم ہیں دلوں کے بندھن نظر کے رشتے
رہیں سلامت مرے ترے عمر بھر کے رشتے

بندھیں گے کیوں کر نہ اب دُعا و اثر کے رشتے
رہے ہیں اشکوں سے رات بھر چشمِ تر کے رشتے

مہکتے سنّاٹوں کا فسوں ہے کہ چاپ تیری
بہت ہی گہرے ہیں راستوں سے سفر کے رشتے

نصیبوں کا اختلاف بھی اتّفاق سا ہے
کسی نوشتے میں جیسے زیر و زبر کے رشتے

ابھی تک آنگن میں ماں کی ممتا بسی ہوئی ہے
کہ جوڑ بیٹھے نہ کوئی گھر سے کھنڈر کے رشتے

کہاں لگے دل کہ اپنی مجبور ہجرتوں نے
اُجاڑ ڈالے ہیں گھر کے مانند گھر کے رشتے

سکون و آرام کے کبوتر دعائیں دیں گے
جو ہوں گے مضبوط بام و دیوار و در کے رشتے

یہ اب کی باتیں نہیں کہ پہلے سے طے ہوا ہے
جُدا نہ ہوں گے مزاج خنجر سے سر کے رشتے

☆☆☆

○

وہ بے گناہ ہے بس یہ گواہی چاہتا ہے
غریب رحمتِ ظلِّ الٰہی چاہتا ہے

نہ ہم ہی چاہیں نہ ایسا خدا ہی چاہتا ہے
تو کون ہے یہ بھَلا جو بُرا ہی چاہتا ہے

ہمارے اُس کے تعلّق میں کچھ صفائی ہو
کہ اعتبار تو صدق و صفا ہی چاہتا ہے

کہیں مہکنے لگیں دستکیں ہتھیلی میں
مشامِ جاں کا دریچہ کُھلا ہی چاہتا ہے

دُعا کہ آہ کی صورت زباں نہیں رکھتی
اثر کہ نغمۂ حرفِ دُعا ہی چاہتا ہے

یہ دل کہ طالبِ درد و کشاکشِ آلام
یہ سر کہ لذّتِ تیغِ جفا ہی چاہتا ہے

خزاں نے ڈال دیئے وسوسے وگرنہ یہاں
کوئی نہیں جو چمن کی تباہی چاہتا ہے

ہوائیں آنے لگیں لے کے مژدہ تریاق
سُنو کہ موسمِ مُردہ جیا ہی چاہتا ہے

☆☆☆

○

سر میں سودا ہے کہ بازار نہ گرنے پائے
فن گرے قیمتِ فنکار نہ گرنے پائے

ضد ہے' اَجداد کا معیار نہ گرنے پائے
ہاتھ کٹنے پہ بھی تلوار نہ گرنے پائے

لوگ کہتے ہیں کہ یہ مَسئلہ میراث کا ہے
بیچ آنگن ہے جو دیوار' نہ گرنے پائے

سر بلندی کا جسے حق ہو اُٹھائے سر کو
ہاں مگر اتنا کہ دستار نہ گرنے پائے

سَو گُناہوں سے تو بہتر ہے یہ توفیقِ ثواب
اپنی نظروں میں گُنہگار نہ گرنے پائے

اب سیاست میں یہی ٹھہری ہے رسمِ تہذیب
بات گر جائے پہ سرکار نہ گرنے پائے

کام آتا ہے بہاروں کے بُرے وقتوں میں
دیکھنا ' دامنِ گُل ۔ خار نہ گرنے پائے

○

نوشتے ہر جبیں پر ایک جیسے
کہاں ہیں سب مقدر ایک جیسے

یہاں سب کے ہیں تیور ایک جیسے
کرم فرما ، ستمگر ایک جیسے

میں ڈرتا ہوں بصارت کھو نہ جائے
نظر آتے ہیں منظر ایک جیسے

یہ کیسی شعلہ باری ہو رہی ہے
ہیں بند آنکھوں میں منظر ایک جیسے

کسے دعوت اب آشفتہ سری دے
ہیں سب ہاتھوں میں پتھر ایک جیسے

قد و قامت کا اندازہ نہیں ہے
قباؤں میں ہیں پیکر ایک جیسے

کبوتر بن کے قاصد کس پہ اُترے
بنے ہیں شہر میں گھر ایک جیسے

وہاں دن، اور یہاں راتیں بڑی ہیں
ہیں جولائی دسمبر ایک جیسے

☆☆☆

○

وقت اپنے ساتھ تہذیب و شرافت لے گیا
لُوٹ کے جیسے کوئی مالِ غنیمت لے گیا

غم کی شدت اور جذبوں کی حرارت لے گیا
خونِ دل آنکھوں سے دامن تک قیامت لے گیا

صبح سے کتنی بڑی وہ شب کی قیمت لے گیا
چھین کر مجھ سے مرے خوابوں کی جنّت لے گیا

قصّۂ عمرِ گریزاں آیا جب انجام پر
اُس کا لہجہ اور مرا حُسنِ سماعت لے گیا

ساتھ میرے تھا تو ساری قربتیں تھیں ہمقدم
چھوٹ کر مجھ سے وہ صدیوں کی مسافت لے گیا

اب کوئی منظر نہ پس منظر نہ حُسنِ ماورا
دُھند کا سیلاب ہر اک شکل و صورت لے گیا

بند آنکھوں میں بھی جیسے شعلہ باری تھی بپا
کیسا منظر تھا کہ آنکھوں کی بصارت لے گیا

کیسے جھونکے تھے ہوا کے، گھر کو ویراں کر گئے
ایک نے دروازہ توڑا، دوسرا چھت لے گیا

☆☆☆

○

دُعا کو چاہیے تاثیر اُلٹی
کہ سیدھی ہو مری تقدیر اُلٹی

زیاں اُن کا ہی ہونا تھا یقیناً
لڑے ہیں لے کے جو شمشیر اُلٹی

بہت دلکش ہے دُنیا کی شکایت
کہ اُس کے خط کی ہے تحریر اُلٹی

خطا ہے آنکھ کی یا رنگِ شب کی
ملی ہر خواب کی تعبیر اُلٹی

زمانے کا حَسین تر اِستعارہ
سرِ دیوار ہے تصویر اُلٹی

خموشی ہی میں ساری عافیت ہے
گلے پڑ جائے گی تقریر اُلٹی

مزاجِ آدمی سے مِلتی جُلتی
گھروں کی چاہیے تعمیر اُلٹی

بہت کام آتی ہے بیماریء دل
اگر ہوتی رہے تدبیر اُلٹی

☆☆☆

○

متاعِ غیرفانی کون دے گا
گئی گُزری جوانی کون دے گا

میں رَن کی اگلی صف تک آچکا ہوں
دُعائے زندگانی کون دے گا

ہَوائیں لے اُڑیں حُسنِ سماعت
جوابِ خوش بیانی کون دے گا

نگاہِ حیرتِ آئینہ کو اب
شعورِ نقشِ مانی کون دے گا

ہر اک منظر میں پس منظر ہے عُریاں
صدائے لَن ترانی کون دے گا

اب اُس کی خوشبوؤں کے موسموں کو
مزاجِ گُل فشانی کون دے گا

اُسے دیکھوں مگر اُس کی نظر سے
یہ مانگے کی جوانی کون دے گا

عطش اب آخری منزل کو پہونچی
سوا خنجر کے پانی کون دے گا

☆☆☆

○

فصلِ گُل میں ذکر اُس کا ہے نظارے کے قریب
بات کچھ کچھ لگ رہی ہے استعارے کے قریب

پھول، خوشبو، روشنی، آنچل، شفق، قوسِ قزح
کھل گئے ہیں رنگ سب اُس کے اشارے کے قریب

جلتے بُجھتے دل کو اُس نے دی ہے یوں روشن اُمید
جیسے جگنو رکھ دیا جائے ستارے کے قریب

ذہن میں اُس کا تصوّر، دل میں اک پُر کیف یاد
یہ سہارا تو نہیں کچھ ہے سہارے کے قریب

ڈوب جاتی ہیں تن آسانی و غفلت کے سبب
کشتیاں چلتی ہیں جو ہو کر کنارے کے قریب

کیا ہواؤں کا بھروسا کس طرف کو لے اُڑیں
کیوں سُبکسارانِ ساحل جائیں دھارے کے قریب

بے سکوں احساس میں یہ سُود اور آسود کیا
وقت وہ آیا کہ ہم پہونچے خسارے کے قریب

غنچہ لب، آہو نظر، زُہرہ جبیں، سیمیں بدن
چشمِ حیرت وا ہو کیسے اس نظارے کے قریب

○

دشمنِ جاں ہیں کہ دیوار نہ دَر بولتے ہیں
شب کے سنّاٹے مگر تابہ سحر بولتے ہیں

جن میں ہمت ہے بلا خوف و خطر بولتے ہیں
بول پاتے نہیں کچھ لوگ مگر بولتے ہیں

مدتوں میں کہ تلاطم کا رہا ہوں خوگر
موجِ خوں دل سے جب اُٹھتی ہے بھنور بولتے ہیں

وقت ملتا ہے تو چھپ چھپ کے سُنا کرتا ہوں
میرے اندر مرے سب عیب و ہُنر بولتے ہیں

یادیں خاموش ہیں اور دل میں ہے محشر برپا
چُپ لگی ہو جو مکینوں کو تو گھر بولتے ہیں

کس کو کس سمت سفر کر کے کہاں جانا ہے
سنگ میل اب بھی سرِ راہ گزر بولتے ہیں

بات بونوں میں بھلا کیسے گنوائی جائے
بات اُونچی ہو تو پھر نیزوں پہ سر بولتے ہیں

○

گلاب و لالہ و سَرو و سَمَن کی قیمت کیا
جو گُل کِھلا نہ سکے اُس چمن کی قیمت کیا

کمی ضرور ہے سورج کی شِدتوں میں مگر
جو روز روز لگے اُس گہن کی قیمت کیا

جنوں کی جَست سے بڑھتی ہے دشت کی وسعت
سمٹ کے بیٹھنے والے ہرن کی قیمت کیا

جبیں پہ آے ء تو قسمت کا انتساب ملے
جو دل میں پڑتی رہے اُس شکن کی قیمت کیا

نئے دماغ نئی گردشوں میں ہیں مصروف
اب اُن کے سامنے چرخِ کُہن کی قیمت کیا

بدل رہے ہیں اب اوزان آہِ نیم شبی
لگے گی میرؔ کے شعر و سخن کی قیمت کیا

شبیبؔ شمعِ سحر ہے کرن کرن تقسیم
نہ ہو یہ شمع تو پھر انجمن کی قیمت کیا

○

یاد بن کر کوئی منظر جاگا
دل کے صحرا میں سمندر جاگا

قصّہء درد رہا یوں تازہ
سو گیا زخم تو نشتر جاگا

اُس کو سوچا ہوئی خوشبو زندہ
اُس کو دیکھا تو گُلِ تر جاگا

بے محابا ہوئی فکرِ فن کار
سنگ کی لوح پہ آزر جاگا

رفتہ رفتہ کوئی پیکر اُبھرا
دھیرے دھیرے کوئی پتّھر جاگا

ہلکے ہلکے وہ نگاہیں اُٹّھیں
چُپکے چُپکے کوئی محشر جاگا

☆☆☆

دلوں کو جو سکون دے وہ اضطراب پھر کبھی
ذرا سی نیند آج ہی بہت سے خواب پھر کبھی

سوال آج پیش ہیں مگر جواب پھر کبھی
حساب رکھتے جایئے کہ احتساب پھر کبھی

مرا عقیدہ وقت نے بھی اختیار کر لیا
کہ ہر عذاب آج ہی کہ ہر ثواب پھر کبھی

سراب پی کے ہمتوں کی تشنگی تو بڑھ گئی
جو سیر کر دے جسم و جاں وہ موجِ آب پھر کبھی

سنبھالے اپنا اپنا نیزہ سارے نیزہ باز ہیں
زمیں پہ آنہ جائے کوئی آفتاب پھر کبھی

نگاہ کر لی پاک، جب سے منظروں کی آگ میں
سما سکا نہ آنکھ میں کوئی گلاب پھر کبھی

کتابِ دل کا پہلا صفحہ اُس کے نام کس کے نام؟
اِسی میں عُمر کٹ گئی کہ انتساب پھر کبھی

مری اُمید و شوق و عرض و التماس کا
فسانہ کچھ دراز ہے تو اے جناب پھر کبھی

☆☆☆

○

اب نہ ہے اندیشۂ تیشہ نہ ڈر پتّھر کا ہے
دل مرا شیشے کا ہے لیکن یہ سر پتھر کا ہے

حُسنِ منظر آئنہ ، حُسنِ نظر پتھر کا ہے
سامنے جو کچھ ہے میرے سر بسر پتھر کا ہے

میرا کیا، میں تو ہر اک جذبے سے عاری ہو چکا
میرا دل پتھر کا ہے ، میرا جگر پتھر کا ہے

شوق منزل ہو چکا ہے بے نیازِ سنگِ میل
راہرو کب سوچتا ہے راہبر پتھر کا ہے

خوبصورت زندگی کے ہر قدم پر ٹھوکریں
شاید اپنے آئنہ خانے میں در پتھر کا ہے

کب سے دشتِ آرزو میں نقش ہے اُس کا خیال
سبز رُت کا منتظر تنہا شجر پتھر کا ہے

آنکھ اُٹھائے وہ تو پھر ہر راہ میں ہے روشنی
سنگدل بن جائے تو سارا نگر پتھر کا ہے

اُس کو اور اُس کی خموشی دیکھ کر آیا خیال
تاج کتنا خوبصورت ہے مگر پتھر کا ہے

☆☆☆

○

کاٹ دے دستِ دعا، لب سے دُعا بھی چھین لے
آ حریفِ جاں، مرے دل سے خدا بھی چھین لے

حرفِ لَب کو قید کر صوت و صدا بھی چھین لے
یہ نہیں ممکن کہ تُو میری اَنا بھی چھین لے

تا کہ مٹ جائیں تیری رُسوائیوں کے سب نقوش
میرے تن کے ساتھ زخموں کی قبا بھی چھین لے

سینۂ دیر و حرم میں اب کبھی دھڑکیں نہ دل
میری مٹّی سے محبت کا نشہ بھی چھین لے

یہ فقط میری نہیں، تیری بھی ہوسکتی ہے بات
اِس لئے بہتر ہے ہونٹوں سے نوا بھی چھین لے

مجھ کو ہرگز اپنے "اشک و آہ" پر قابو نہیں
تیرے بس میں ہو تو یہ "آب وہَوا" بھی چھین لے

اب مروّت یا حیا کی بات پوشیدہ نہ رکھ
آگ خیموں میں لگا سر سے رِدا بھی چھین لے

○

یہاں سے گُزرو تو نیزوں پہ سر اُٹھائے رہو
اندھیرا صدیوں کا ہے مشعلیں جلائے رہو

ستم نے شامِ غریباں میں کر دیا اندھیر
کرم کرو مرے اشکوں کی لو بڑھائے رہو

فرات ہو چکی پیاسوں کے واسطے زہراب
عبث ہے ہونٹوں پہ پہرے جو تم لگائے رہو

ابھی تک آخری خیمہ ہمارا جلتا ہے
تم اپنے ذوقِ نظارہ کو جگمگائے رہو

کبھی دیا ہے جو اَب دشت پانی دے دے گا
عطش کی فصل مرے لب پہ تم اُگائے رہو

تمھارا حکم کہ گردن جُھکی رہے سب کی
مرے قبیلے کا قانون سر اُٹھائے رہو

یُورِش ہے ہم پہ کہ شانوں سے ہاتھ کٹ جائیں
ہمارے دل کا تقاضا، علم اُٹھائے رہو

○

میں آج تک اَنا کو لیے اپنے سر میں تھا
کس درجہ لطفِ بے خبری اِس خبر میں تھا

کیسا طلسم تھا کہ جہاں کی نظر میں تھا
منظر بھی لگ رہا تھا کہ اُس کے اثر میں تھا

ساری تھکن کو بُھولا ہوا میں سفر میں تھا
بس آشیاں کا دھیان مرے بال و پر میں تھا

میں منقسم مظاہرِ عیب و ہُنر میں تھا
وہ کون تھا جو مجھ کو سنبھالے بشر میں تھا

سمتوں کو خود شناسی کا اُس سے پتہ ملا
جو سنگِ میل نصب مری رہ گزر میں تھا

ہجرت کا سَیلِ تُند بہالے گیا اُسے
بچپن کا گھر جو ریت کے دیوار و در میں تھا

نامہ تھا اُس کی سادگیء دل کا آئنہ
لکھّا ہُوا تھا وہ جو دلِ نامہ بر میں تھا

پھر یوں ہُوا کہ چھا گیا دریا پہ اک سکوت
کشتی سے سب نے دیکھا کہ ساحل بھنور میں تھا

☆☆☆

○

وراثت اپنے گھروں کی گھروں میں رہنے دے
پُرانے خواب ابھی بستروں میں رہنے دے

ابھی تو باقی ہیں نا آفریدہ رنگ بہت
نہ کھول آنکھ اُنھیں منظروں میں رہنے دے

کبھی تو گونجے گا ان پیکروں کا سناٹا
ادھوری ضرب کی لے پتھروں میں رہنے دے

نہ جانے کب مجھے لڑنا پڑے اندھیروں سے
چمن کے شعلے مرے شہپروں میں رہنے دے

حسینؑ جا چکے اب کون سر کٹائے گا
خمارِ ذوقِ ستم خنجروں میں رہنے دے

نہ کر فرشتوں کی اونچی اُڑان میں شامل
ہمیں ہمارے اِنھیں پیکروں میں رہنے دے

تسلّی دے کے مرے غم کا انکشاف نہ کر
سکون سے مجھے نوحہ گروں میں رہنے دے

مرا کلیجہ نہ پھٹ جائے حرفِ شیریں سے
یہ بارِ عشق ہے پیغمبروں میں رہنے دے

☆☆☆

○

سفر کا شوق سفر سے زیادہ رکھتے ہیں
ہم اپنے پاؤں کے ہمراہ جادہ رکھتے ہیں

تہی مآل زمانے سے اور کیا مانگیں
یہ کم نہیں کہ توقع زیادہ رکھتے ہیں

روایتوں کی جگہ ہے رقابتوں کا ہجوم
خوشا کہ ہم بھی بڑا خانوادہ رکھتے ہیں

جبیں پہ نقشِ تفوق نہ لب پہ صوتِ غرور
مثال صفحۂ دل، حرفِ سادہ رکھتے ہیں

غم و ستم کو اجازت ہے چاہے جب آئیں
ہم اہلِ درد دلوں کو کُشادہ رکھتے ہیں

لبوں پہ رنگِ تبسم سجانے والے بھی
چُھری فریب کی، زیرِ لبادہ رکھتے ہیں

○

پلایا روشنی کا زہر کس نے
کھلی آنکھوں پہ ڈھایا قہر کس نے

بہت آسیب ہے یہ آگہی بھی
بدل ڈالا مزاجِ دہر کس نے

لڑائی کی مجھے خواہش نہیں تھی
گھروندوں کا بنایا شہر کس نے

میں خود سے بے خبر تیشہ بکف تھا
چٹانوں سے نکالی نہر کِس نے

میں اونچے پربتوں سے دیکھتا تھا
کہ جھرنوں میں ملایا زہر کِس نے

کوئی گھر ہے نہ رستہ قربتوں کا
بسایا ہے یہ میرا شہر کِس نے

○

کتنی بھوکی ہے کتنی پیاسی ہے
زندگی دشتِ کربلا سی ہے

سب گئے شمعِ دل جلائے ہوئے
خیمہ خیمہ بہت اُداسی ہے

اُس نے کتنی لطیف بات کہی
خود شناسی خدا شناسی ہے

پھیل جائے تو اک کتاب بنے
بات کہنے میں جو ذرا سی ہے

کچھ تو وہ بھی وفا پرست رہے
کچھ یہ دُنیا بھی بے وفا سی ہے

خواب کی لے میں اُس کی انگڑائی
موجِ گلبانگِ خوش اداسی ہے

○

جو پیماں راہبر سے باندھ رکّھے تھے
بہت نامعتبر سے باندھ رکّھے تھے

جو بندھن ہمسفر سے باندھ رکّھے تھے
حدِ شام و سحر سے باندھ رکّھے تھے

وہ چڑھتی دھوپ سے کم دیر پا نکلے
اِرادے جو سحر سے باندھ رکّھے تھے

لہو ، ممتا ، زباں اور پیڑ آنگن کا
عجب رشتے یہ گھر سے باندھ رکھّے تھے

مسافت شام تک جن کی مقرر تھی
وہ رستے بال و پر سے باندھ رکھّے تھے

نہ جانے کون کب صحرا میں کام آئے
کئی سائے شجر سے باندھ رکھّے تھے

زمانے کو بھی لڑنے کا سلیقہ تھا
کفن ہم نے بھی سر سے باندھ رکھّے تھے

پسند آیا تماشا نا پسندیدہ
تماشائی نظر سے باندھ رکھّے تھے

☆☆☆

○

بجز اک حُسنِ منظر کیا لکھوں میں
ترا قد تیرا پیکر کیا لکھوں میں

ذرا سا خط بدل کر کیا لکھوں میں
تجھے اب زندگی بھر کیا لکھوں میں

سبھی اُس کے مظاہر موج در موج
صبا، صحرا، سمندر کیا لکھوں میں

صحیفہ دل کا اُس کے سامنے ہے
دُعاؤں کے ورق پر کیا لکھوں میں

پڑھے گی کیسے چشمِ بے بصیرت
کسی دیوار کو در کیا لکھوں میں

یہ نازک چوٹ کتنی سخت ہوگی
کسی شیشے کو پتھر کیا لکھوں میں

وہاں بھی اپنی پرچھائیں ہے ہمراہ
مگر اس دشت کو گھر کیا لکھوں میں

وہی پت چھڑ، خزاں اور سرد موسم
وہی قصّہ مکرر کیا لکھوں میں

☆☆☆

○

سایہ سایہ کر کے منوّر میں کب سے
ڈھونڈھ رہا ہوں اپنا پیکر میں کب سے

اپنی نظر میں ہوگیا بہتر میں کب سے
ایسا ہُوا قسمت کا سکندر میں کب سے

صحراؤں کی ریت سمیٹے آنکھوں میں
جھانک رہا ہوں سات سمندر میں کب سے

باہوں کی پتوار سہارا دے مجھ کو
ڈوب رہا ہوں اپنے اندر میں کب سے

دُنیا سنگِ میل سمجھ بیٹھے نہ کہیں
تیرے لیے ہوں راہ کا پتھر میں کب سے

جُرعہ جُرعہ پیاس میں پیتا آیا ہوں
قطرہ قطرہ خُون لُٹا کر میں کب سے

چھوٹے بڑے کا فرق ابھی تک باقی ہے
بیٹھا ہُوا ہوں اُس کے برابر میں کب سے

راہ چُھپادی ریت میں شب کی آندھی نے
ڈھونڈھ رہا ہوں اپنا ہی گھر میں کب سے

☆☆☆

○

خموشیوں کو کچھ اِس طرح سے زباں کر دے
کہ تیری آنکھ اُٹھے اور مجھے بیاں کر دے

مزاجِ چشمِ محبت کو مہرباں کر دے
اُجالا دے کے اُجالے کو جاوداں کر دے

حصارِ حرفِ ملامت میں خود کو قید نہ کر
اُسے بڑھا کے زمانے کی داستاں کر دے

متاعِ غم کی طرح میری بھی حفاظت کر
میں گُزرا وقت نہیں، تو جورائگاں کردے

اُسے تلاش نہ کر آئنہ در آئینہ
کسے خبر ہے کہ جادو کوئی کہاں کردے

بھٹکتی سمت مری دسترس میں آجائے
ہوا جو کھول کے دامن کو بادباں کردے

پھر آگیا ہے وہ موسم مہ و نجوم لیے
جو اِس زمین کے منظر کو آسماں کردے

○

راہِ نامعلوم میں سمتِ سفر محفوظ رکھ
یعنی اپنی آنکھ میں شام و سحر محفوظ رکھ

کربِ ہجرت بھی بڑھا دیتا ہے اکثر فاصلے
شعلۂ آب و ہوا میں بال و پر محفوظ رکھ

مطمئن ہے تُو، تو کیوں؟ یہ راز کُھلنا چاہئے
ساری دُنیا ہے پریشاں، یہ خبر محفوظ رکھ

دیکھ اندھوں کی طرح منظر کی شعلہ باریاں
آنکھ اپنی کھول دے لیکن نظر محفوظ رکھ

کل کی تہذیبوں کا ماتم گردشوں پر چھوڑ دے
آج کے پتھراؤ سے شیشے کا گھر محفوظ رکھ

آج کی شب کا تقاضا ' بے جہت پتھراؤ ہے
ہو سکے تو صبح تک خوابوں کا گھر محفوظ رکھ

گر سفر آساں بنانا ہے تو پھر ایسا بھی کر
فاصلوں میں قُربتوں کی رہ گُزر محفوظ رکھ

مُٹھیوں میں بند کر لے جُنبشِ موجِ صبا
سبز موسم کی خوشامد کا ہُنر محفوظ رکھ

☆☆☆

○

نظر میں کھنچتی ہے روشن لکیر، شام کے بعد
فضا میں کون چلاتا ہے تیر، شام کے بعد

سیاہ دن تھا جسے تم سفید سمجھے تھے
یہ مجھ سے کہتا ہے میرا ضمیر، شام کے بعد

سخاوتوں کو بھٹکنے کا حوصلہ نہ رہے
جلا کے دیکھو چراغِ فقیر، شام کے بعد

یہ بیتی رات کا دُکھ ہے کہ انتظارِ سحر
یہ کس نے بھیجا ہے اپنا سفیر' شام کے بعد

جنھیں میں سُن نہ سکا قلبِ بے سماعت سے
وہ دستکیں ہیں مری دستگیر' شام کے بعد

نہ جانے کانوں میں کیسا تھا شور دن بھر کا
خموشیوں میں رہی دارو گیر' شام کے بعد

بچھڑ کے بچّوں سے' آزاد رہ نہیں سکتا
سکونِ دل کی طلب کا اسیر' شام کے بعد

○

یوں بھی ہوتی ہیں دعاؤں میں اثر کی باتیں
سُن رہا ہوں میں اِدھر رہ کے اُدھر کی باتیں

وہ پرندے جو گئے سیدھی اُڑانیں بھر کے
گھر کو لوٹے تو سُنائیں گے سفر کی باتیں

دیکھنا بڑھ کے گئے سال کا موسم تو نہیں
کون دروازے پہ سُنتا ہے یہ گھر کی باتیں

بس محبت کا بیاں اِس کے سوا کچھ بھی نہیں
دل کے سنّاٹے مٹاتی ہیں نظر کی باتیں

دل جل اُٹھتا ہے تو لو شام سے لگ جاتی ہے
شام آتی ہے تو ہوتی ہیں سحر کی باتیں

ذکرِ منزل بھی ہے ہر موڑ کی خاموشی میں
راہرو سنتا ہے کب راہ گزر کی باتیں

تیغِ قاتل مجھے کھینچے گی سرِ دشت طلب
کوفہءِ عشق میں ہوں گی مرے سر کی باتیں

عہدِ دانش میں شبیبؔ آہ یہ قدروں کا زوال
عیب سی لگنے لگیں اب تو ہُنر کی باتیں

○

نقش کھینچے ہے عجب شام و سحر پانی پر !
روز و شب ہوتا ہے رنگوں کا سفر پانی پر

وہ ہے ساحل پہ مگر اُس کی نظر پانی پر
موج در موج گئی ہے یہ خبر پانی پر

پاؤں زنجیرِ تلاطم میں ہیں سر پانی پر
دل کی اُمّید ہے بس سینہ سپر پانی پر

کوئی آہٹ ہے تعاقب میں کہاں جاؤں میں
یا خدا تُو ہی بنا راہ گزر پانی پر

اب زمیں کیسی جزیرے بھی نہ بچ پائیں گے
کوئی گھر بیٹھے نظر رکھتا ہے ہر پانی پر

یاد آجائے تو پھر پیاس بڑھا دیتا ہے
کسی صحرا کا ابھی تک ہے اثر پانی پر

کھیت کے قتل کو موسم سے بھی پوچھا جائے
کون مجرم ہے ؟ تصادم تھا اگر پانی پر

دستِ صنعت گرِ کشمیر کو چومے کوئی
کس سلیقے سے بنا لیتا ہے گھر پانی پر

☆☆☆

○

کیا کہیں اُس سے شناسائی کی بات
جُھوٹ بَن جائے نہ سچّائی کی بات

ضبط کی صبر و شکیبائی کی بات
یوں بھی ہو دل کی توانائی کی بات

اوّل اوّل وحشتِ دل' نام تھا
آخر آخر ہے جو دانائی کی بات

ہم بُھلا بیٹھے تھے دل کی چوٹ کو
چھیڑدی موسم نے پُروائی کی بات

نقشِ موجِ آب تھی اُس کی نگاہ
کھو گئی ہے کہہ کے گہرائی کی بات

اُس کے ہونٹوں پر چراغاں ہوگیا
کی جو ہم نے اپنی تنہائی کی بات

کچھ سُبکسارانِ ساحل آج تک
سوچتے رہتے ہیں گہرائی کی بات

داستانِ ظلم باقی تھی ابھی
درمیاں میں آپڑی بھائی کی بات

☆☆☆

ماتا کہ ہے زمین سفید، آسماں سفید
دیکھوں جو آنکھ کھول کے پھر سب کہاں سفید

چہرہ سفید، بات سفید اور زباں سفید
یہ سب قبول، ہو جو دلِ دوستاں سفید

سادہ ورق نہیں ہے کتابِ حیات کا
لکھّی ہوئی ہے اس میں مری داستاں سفید

آہیں مری ہیں اُس کے تصوّر سے تابناک
بھرپور چاندنی میں ہو جیسے دھواں سفید

خدشات بھی ہیں تازہ اُمیدوں کے آس پاس
بُھونرں کے ساتھ جیسے اُڑیں تتلیاں سفید

کیسی تھی برفباری کہ منظر بدل گیا
اُجلے مکیں سیاہ ہیں، کالے مکاں سفید

سورج نہیں تو کون ہے اِس جرم میں شریک
انسان ہیں سیاہ تو پرچھائیاں سفید

تاریک زاویہ ہو تو آئینہ بھی سیاہ
اچھا لگے نظر کو تو سارا جہاں سفید

☆☆☆

○

یوں اُس نے کالی آنکھوں میں چاہی نظر سفید
اپنے سوا دکھائی نہ دے کوئی گھر سفید

ہاں آپ کی دُعا سے گئی شب، سحر ہوئی
میرے سیاہ شہر سے نکلی ڈگر سفید

صد شکر برفباری نے سب کچھ چھپا دیا
کچھ روز تو رہے گا، نگر کا نگر سفید

سمجھو کہ ماہ و سال کا چہرہ اُتر گیا
کمرے میں پائے جائیں کلنڈر اگر سفید

تخلیق کامیاب ہے گر اِس طرح سے ہو
رخسار زرد ' سینہ سیہ اور کمر سفید

○

زیادہ سفید کون ہے اور کون کم سفید
بیکار ہے یہ بحث نہ تم ہو نہ ہم سفید

کتنے سیہ دلوں نے سیاہی مَلی، مگر
سجدوں کی روشنی میں ہیں دیر و حرم سفید

مجرم تھا میں تو وہ بھی رہا ہے شریکِ جُرم
لکھتا رہا گُناہ کی باتیں قلم سفید

بکھرے گی چاندنی تو یقیں دل کو آئے گا
دیکھی نہیں ہے ہم نے ابھی شامِ غم سفید

منزل پہ چھائی دُھند کا بھی اپنا رنگ ہے
چلنے کا حوصلہ ہو تو ہے راہِ غم سفید

ہم ہی سیاہ کار رہے روشنی کے ساتھ
حالانکہ اور بھی تھے کئی محترم سفید

رنگِ حیات و موت ہے شاید یہی شبیبؔ
وہ ہم پہ منکشف ہو تو ہست و عدم سفید

○

دل میں نہ رکھوں آج کوئی آرزو سفید
سیلِ سیہ میں رہتی نہیں آبجو سفید

اے مالکِ سفید و سِیہ تھوڑا وقت اور
کرلیں گُناہ گار بھی کچھ گفتگو سفید

ممکن ہے اُس کی یاد ہو یا میرا خواب ہو
کل شب سے کوئی شے ہے مرے روبرو سفید

گھر میں یہ اختلاف ! عجب اتفاق ہے
اِس کا ہے دل سیاہ تو اُس کا لہو سفید

وہ شہرِ باوقار سلامت رہے ، جہاں
ہر ایک رو سیاہ کی ہے آبرو سفید

نیرنگیٔ زمین و فلک یوں بھی دیکھیے
تاریکیاں یہی ہیں کہ ہیں چار سو سفید

○

جوابِ خط میں جو رودادِ زندگی لکھنا
مرا بھی حال وہاں سے کبھی کبھی لکھنا

تم اپنی صبح میں جو چاہے جا کے لکھ لینا
ہماری رات میں خوابوں کی خودکشی لکھنا

جواب پانے کو ابکی دُعائیں جب کرنا
ہماری صبح میں تھوڑی سی تیرگی لکھنا

پڑھوں تو روشنی در آئے شیشۂ دل میں
کتابِ سنگ پہ وہ حرفِ آگہی لکھنا

حدیثِ فصلِ خزاں جب تمام ہو جائے
تو اپنے نام کے آگے شگفتگی لکھنا

وہ پڑھنا چاہتا ہوں جو نہ پڑھ سکوں گا کبھی
جو بات لکھ نہیں سکتے ہو تم، وہی لکھنا

○

شامل جو میرے حال کی رسوائیوں میں تھا
دل کہہ رہا ہے وہ بھی مرے بھائیوں میں تھا

خود اپنا زہر پی کے میں سقراط ہو گیا
اتنا سا جھوٹ بھی مری سچّائیوں میں تھا

ہوتی خبر مرے قد و قامت کی کیا اُسے
سورج کھڑا ہُوا مری پُرچھائیوں میں تھا

رنگِ سحر ہے کس کے لیے، یہ نہ کُھل سکا
حالانکہ میں بھی شب کے تماشائیوں میں تھا

دیوانگی ، غرورِ خودی اور آگہی
کچھ ایسا شور بھی مری تنہائیوں میں تھا

سوچا تو کائنات سے بھی میں گزر گیا
دیکھا تو اپنی ذات کی گہرائیوں میں تھا

○

دن جو آئے گا بے سحر ہوگا
یعنی اب جسم پر نہ سر ہوگا

اِس سفر میں جو ہم سفر ہوگا
کون اب اتنا معتبر ہوگا

سارے خیمے جلا دیے اُس نے
اب تو صحرا ہی اپنا گھر ہوگا

وہ شناسا ہے سب کے چہروں کا
بس ذرا خود سے بے خبر ہوگا

اتنا روشن دماغ وہ کب تھا
اُس کے پیکر پہ میرا سر ہوگا

یہ جو ہے جسم کی حویلی میں
عہدِ رفتہ میں با اثر ہوگا

نقشِ دیوار اک پرندہ ہے
اگلے وقتوں کا نامہ بر ہوگا

سادہ ہوں گے کتاب کے اوراق
میرا ذکر اتنا مختصر ہوگا

☆☆☆

○

بُرائیوں کے نہ اچھائیوں کے چہرے ہیں
یہ شام و صبح تو رُسوائیوں کے چہرے ہیں

کسی پہ مکر، کسی پر ہے مصلحت سازی
بہت حسین مرے بھائیوں کے چہرے ہیں

عجب ہے منظرِ عبرت ! مرے تماشے میں
سَروں کے پیچھے تماشائیوں کے چہرے ہیں

نہ جانے حال ہے کیسا فگار جسموں کا
کہ داغ داغ سے پرچھائیوں کے چہرے ہیں

شکستہ خواب ' ادھورے خیال ' اندیشے
یہ سب کے سب مری تنہائیوں کے چہرے ہیں

○

کتاب بند سہی، حرفِ تر کھُلا رکھنا
مُباحثے کا ہمیشہ ہی دَر کھُلا رکھنا

بشارتوں کی توقع ہے صبح ہونے تک
صحیفہء سرِشب، طاق پر کھُلا رکھنا

سکوتِ شب سے بھی اُکتا کے لوٹ سکتا ہوں
میں کہہ کے آیا ہوں بچّوں سے گھر کھُلا رکھنا

ہماری شرط کہ ہم پر ہو سایۂ رحمت
تمھاری ضِد ہے کہ کوفے میں سر کُھلا رکھنا

شکستگی ہوئی ظاہر تو موت لازم ہے
کُھلی ہَواؤں کے دھارے پہ پَر کُھلا رکھنا

ہماری سوچ میں اُبھرا تو اُس نے یہ بھی کہا
تم اپنے ماتھے پہ رنگِ سحر کُھلا رکھنا

کسی کا ہاتھ بڑھے یا کھچے یہ اُس کا نصیب
ہمارا فرض ہے دستِ ہُنر کُھلا رکھنا

○

کچھ صحیفے آسماں پر نور سے لکھّے گئے
میں نہیں تو کس لیے کس کے لیے لکھّے گئے

میں بہت معصوم تھا پر جرمِ ہستی تب کُھلا
جب مرے اَجداد و آباء کے پتے لکھّے گئے

ایک رحمت تھی ہوئی جو خیر و شر میں منقسم
ایک نعمت تھی مگر دو ذائقے لکھّے گئے

میں کتابِ لَن ترَانی میں رہا بین السّطور
گرچہ اُس کے ترجمے اور حاشیے لکّھے گئے

میرے در پر دار کی صورت میں روشن ہیں ابھی
وہ نوشتے جو اَنا کے خون سے لکّھے گئے

رات کی چیخیں، سحر کا خون، دن کا شوروشر
یُوں بھی اکثر زندگی کے مرثیے لکّھے گئے

شب کا وعدہ، دن کی لالچ، موسموں کا سبز باغ
میرے نام اِس سال بھی کچھ سانحے لکّھے گئے

شاعرانہ حسیّت کا یہ بھی اک اسلوب ہے
شعر کے بدلے ردیف اور قافیے لکّھے گئے

☆☆☆

○

وہ تر زباں سخنِ حق شناس کہتا تھا
یہ اور بات کہ وہ پیاس پیاس کہتا تھا

ہُوا یہی کہ ملا نُور کے حجابوں میں
برہنگی کو جو اپنا لباس کہتا تھا

میں اُس کی بخشی ہوئی زندگی کا مجرم ہوں
یہ سب کے سامنے وہ بے ہراس کہتا تھا

مرے وجود کی قاتل ندی بھی قتل ہوئی
کل ایک قطرہ سمندر کے پاس کہتا تھا

پھر ایک دن میں اِنھیں جنگلوں میں لوٹوں گا
یہ صدیوں قبل ہی میرا قیاس کہتا تھا

○

احساس کی منزل میں ہے ہر راہِ اماں بند
آنگن میں کُھلی آگ ہے کمرے میں دھواں بند

فریاد پہ پہرہ ہے نہ ہے سعیء فغاں بند
اک رسمِ شرافت ہے جو ہے اپنی زباں بند

اک حرفِ محبت ! کہ زباں رُک سی گئی ہے
یا نقشِ کرامت ہے کہ ہے آبِ رواں بند

حیران ہیں ہم، سنگ بکف ایسا سماں ہے
آئینوں کی بستی میں ہے ہر ایک مکاں بند

اب دشت کے خوابوں کی نہ لگ پائے گی قیمت
سُنتے ہیں کہ ہے شہر میں ہر ایک دُکاں بند

پھر کیوں نہیں سنّاٹوں کے سینوں میں تلاطم
مندر میں خموشی ہے نہ مسجد میں اذاں بند

اک جامِ حبابِ سرِ دریا تو ہے لیکن
اندیشۂ جاں سے ہے لبِ تشنہ وہاں بند

☆☆☆

○

سراب سے نہ سمندر سے ہو کے گزری ہے
جنوں کی موج مرے سر سے ہو کے گزری ہے

مرا نشاں، مری منزل، مرا پتہ ہے یہی
ہر ایک راہ مرے گھر سے ہو کے گزری ہے

میں آنکھ کھولنا چاہوں تو میرے بس میں نہیں
نظر، یہ کون سے منظر سے ہو کے گزری ہے

سحر ہے وہ جو رُکی ہے کسی شبستاں میں
یہ رات ہے جو مرے گھر سے ہو کے گزری ہے

بنی ہوئی تھی تلاطم جبینِ آزر میں
وہ جوئے فکر جو پتّھر سے ہو کے گزری ہے

یہ سانحہ بھی ہُوا' موت کے تعاقب میں
حیات' منزلِ خنجر سے ہو کے گزری ہے

○

غور سے تم کس لیے تکتے ہو دیوانو مجھے
آئنے میں خود کو دیکھو اور پہچانو مجھے

کیوں بھلا پڑھتے رہو میری کتابِ زندگی
کیا ضروری ہے کہ حرفِ معتبر مانو مجھے

زلف بکھراؤ نہ میری شام قسمت کی طرح
کیوں پریشاں کر رہے ہو اے پریشانو مجھے

میری ہستی کا تعارف کس لیے کس کے لیے
میں بھی خود نا آشنا ہوں تم بھی کیا جانو مجھے

کون ہوں، کیسا ہوں، کیا ہوں کیا کرو گے جان کر
کس نے پوچھا ہے جو تم پوچھو گے ویرانو مجھے

اپنی صبحوں کے لئے کب سے گریباں چاک ہوں
میری راتوں سے نکالو میرے ارمانو مجھے

ایک دن وہ خود سے بے پروا سراسر آئے گا
گویا پس منظر سے کھچ کر صاف منظر آئے گا

دھیرے دھیرے ضربِ فکروفن اُسے دے گی نجات
رفتہ رفتہ سنگ سے باہر وہ پیکر آئے گا

اس کو اپنے جسم کے خاطر مرا سر چاہیے
یوں قد و قامت میں وہ میرے برابر آئے گا

جتنا وہ حسّاس ہے اُتنا ہی اُس کا کرب ہے
کھڑکیاں شیشے کی رکّھے گا تو پتّھر آئے گا

سوچ کا رستہ کٹے، منزل ملے، تھک کر گرے
لوگ کہتے ہیں کہ تب وہ لوٹ کر گھر آئے گا

کچھ دعاؤں میں اثر ہے اور نہ جذبوں میں کشش
آسماں سے اب زمیں پر کون لشکر آئے گا

○

یہ غم نہیں ہے کہ میں حلقۂ گناہ میں ہوں
خوشی تو یہ ہے صداقت کی قتلگاہ میں ہوں

خزاں رسیدہ شجر اپنا درد خود جانے
میں شاخ شاخ نئی فصل کی پناہ میں ہوں

مقابلے کا نتیجہ مجھے بھی ہے معلوم
ہیں جس کے چھوٹے بڑے ہاتھ اُس سپاہ میں ہوں

خبر نہیں سرِ منزل ہوں یا پسِ منزل
میں اپنے گھر سے الگ ہوں نہ اپنی راہ میں ہوں

کسی میں تابِ نظر ہو تو دیکھ لے پڑھ لے
ڈھکا چُھپا سا حکایاتِ مہر و ماہ میں ہوں

دُعا قبول ہو کس کی ؟ کسے جواب ملے ؟
اگرچہ میں بھی حقیقت کی بارگاہ میں ہوں

○

صحرا ملے ، سراب ملے ، کربلا ملے
اب دیکھنا ہے راہِ محبت میں کیا ملے

کیا جانے کس جگہ ہوں مگر یہ بھی ہے خبر
میں اُس جگہ کھڑا ہوں جہاں پر خدا ملے

میں مر گیا ہوں اپنی شرافت کے نام پر
اس کی نہیں ہے فکر ، مجھے خوں بہا ملے

کس کو پکاروں کس سے کہوں بے خطا ہوں میں
حالانکہ قتل گہ میں کئی آشنا ملے

میرے سوال سو گئے بہروں کی بزم میں
مجھ کو ملے جواب مگر بے صدا ملے

میں بے زباں ہوں سعیء تکلّم بھی کیا کروں
کیوں میرے قاتلوں کو مری بددعا ملے

لو کاٹ لو زبان کہ سچ بولتا ہوں میں
شاید اِسی طرح سے تمھیں کچھ مزا ملے

○

آئنہ آئنہ کم اور تماشا ہے بہت
دیکھتا کم ہے ہر اک چہرے کو تکتا ہے بہت

کچھ نہ کچھ ترکِ تعلق سے تعلق رکھیے
یاد رکھنے کو یہ ٹوٹا ہُوا رشتہ ہے بہت

محفل غم کا سجانا بھی ضروری تو نہیں
خامشی میں بھی تو اظہار تمنا ہے بہت

زاویہ ٹھیک تو ہونے دو ابھی سورج کا
حُسنِ صحرا کے لئے ایک ہی ذرّہ ہے بہت

کس کو فرصت ہے کہ اب سات سمندر جھانکے
آنکھ میں آیا ہُوا ایک ہی قطرہ ہے بہت

اب تو ہونٹوں کا تبسّم بھی نہیں ہے اپنا
پھر بھی کیا کم ہے کہ یہ غیر بھی اپنا ہے بہت

○

ڈھوپ کے شہر میں جسموں کو چُرائے رکھیو
اپنے ہمراہ فقط جسم کے سائے رکھیو

ہر روایت سے بغاوت نہیں اچھی لگتی
کم سے کم عشق کی میراث بچائے رکھیو

کیا خبر کل کے اُجالے کی ہو صورت کیسی
صبح تک بزم کی شمعوں کو جلائے رکھیو

دیکھنا ہو جو تمھیں سنگِ ملامت کا خلوص
ہر جگہ شیش محل دل کا ' سجائے رکھیو

اپنی قسمت کی طرح میں بھی بدل سکتا ہوں
میری خاطر ہی سہی مجھ کو منائے رکھیو

کربِ احساس' دروں بینی و آشوب حیات
درد جیسا بھی ہو سینے سے لگائے رکھیو

بارِ احساس گُناہوں سے سوا کیا ہوگا
زندگی کل کے لئے آج اُٹھائے رکھیو

مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تخلیقات

مجموعۂ سلام		۱۹۶۰ء کے آس پاس
آتشِ چنار	غزلوں، نظموں کا انتخاب	۱۹۷۹ء
حرف فروزاں	حمد و نعت و منقبت	۲۰۰۰ء
بچوں کے مشاعرے	موضوعاتی نظمیں	۲۰۱۰ء
فردوسِ زمیں	کشمیر سے متعلق نظمیں	غیر مطبوعہ
کلام شیخ العالمؒ	منظوم اُردو ترجمہ	زیرِ ترتیب

★★★